مسلمانوں کا ''یہودی'' مسئلہ

دنیا بھر کے مسلمان چاہے وہ مغرب میں بستے ہوں یا اسلامی ممالک میں، اکثر و بیشتر سیاستِ عالم پر گفتگو کرتے وقت، خصوصاً ان مسائل پر گفتگو کرتے وقت جن کا تعلق ان کے اپنے سماجی اور سیاسی مسائل سے ہو، اپنی ہر مشکل کا ذمہ دار یہودیوں کو، یہودی سازشوں کو، اور صیہونیت کو ٹھیراتے ہیں۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ ان میں پڑھے لکھے مسلمان بھی شامل ہوتے ہیں اور عام مسلمان بھی۔ مسلمانوں کے ابلاغِ عامہ کے ذرایع میں، خصوصاً عرب ذرایع ابلاغ میں یہودیوں کو دشمن قرار دینا ایک عام بات ہے۔ اس رائے کے حامل مسلمانوں کی رائے میں اسرائیلیوں اور فلسطینیوں کے درمیان سالہا سال سے جاری قضیہ کا حل اسرائیل کو فنا کر دینا ہے۔ اس ضمن میں اکثر یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کے اسرائیلیوں کو فلسطین کی سرزمین پر رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اور یہ کہ ارضِ فلسطین پر اسرائیل کا قیام غاصبانہ ہے۔

فلسطین کی زمین پر اسرائیلیوں کی رہائش کے حق کو باطل قرار دینے والے اس ضمن میں قرآن کی سورۃ مائدہ کی آیات نمبر ۲۰ اور ۲۱ کو فراموش کر دیتے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کے ذریعہ بنی اسرائیل کو ''ارضِ مقدس'' میں داخل ہونے کا حق دیا تھا، اور بنی اسرائیل اس خوف کی بنا پر کہ اس ''ارضِ مقدس'' پر اس وقت ان سے زیادہ طاقت ور لوگوں کا قبضہ تھا، وہاں داخل ہونے سے انکاری تھے۔ پھر اللہ کی تنبیہ کی بنیاد پر بنی اسرائیل چالیس سال تک اس سرزمین میں داخل نہ ہو سکے اور بعد میں ''حضرت یوشع بن نون کے عہدِ خلافت میں بنی اسرائیل اس قابل ہوئے کہ وہ فلسطین کو فتح کر سکیں''۔ حضرت موسیٰ کو ارضِ مقدس میں داخل ہونے کا حکم انجیل میں تفصیل سے مذکور ہے جس کے حوالے مسلمان مفسرینِ قرآن بھی دیتے ہیں۔

ان آیات کی تفسیر کرتے ہوئے دورِ حاضر کے تین اہم مفسرین، مولانا مودودی، عبداللہ یوسف علی، اور مولانا وحیدالدین خاں، اس بات پر متفق ہیں کہ جس سرزمین کو قرآن کی محولہ بالا آیات میں ارضِ مقدس قرار دیا گیا ہے وہ فلسطین اور شام کی سرزمین ہے۔ اس قرآنی حوالے سے یہ بات واضح طور پر طے ہو جاتی ہے کہ بنی اسرائیل کو ارضِ فلسطین میں رہنے کا مکمل حق ہے بلکہ ان کو خدا کا حکم ہے کہ وہ اس زمین پر قیام کریں۔ اس لیئے جو بھی صاحبِ ایمان فی زمانہ بنی اسرائیل کی ریاست کو فنا کرنے کی بات کرتا ہے وہ دراصل حکمِ خداوندی کا انکاری ہے۔ گو بعض مسلمان یہ دلیل دے سکتے ہیں کہ جب بعد میں احکامِ قرآنی کے ذریعہ بنی اسرائیل کی فضیلت ختم کی گئی تو سرزمینِ فلسطین میں رہنے کا ان کا استحقاق بھی ختم ہو گیا۔ لیکن چونکہ قرآن اس ضمن میں خاموش ہے سو یہ موضوع ہمیشہ زیرِ بحث رہے گا۔ اس ضمن میں ہمیں یہ ضرور یاد رکھنا چاہیئے کہ یہودی اس معاملہ میں توراۃ اور انجیل کے حوالے پیش کرنا کا حق رکھتے ہیں، اور ان پر ہرگز لازم نہیں کہ وہ قرآنی آرا پر دھیان دیں۔

مسلمانوں میں یہودی سازشوں اور صیہونیت کو ہر مسئلہ کا ذمہ دار قرار دینے کی بات دراصل یہودیوں کی علمی، سائنسی، معاشی برتری، اور دنیا کے مراکزِ اقتدار میں ان کے گہرے اثر و رسوخ کے ردِعمل کی بنا پر ہوتی ہے۔ یہ ردِعمل دنیا بھر میں مسلمانوں کے زوال خصوصاً نوآبادیت کے خاتمہ پر اسرائیل کے قیام اور مسلمانوں کی پسماندگی کے نتیجہ میں اور بھی شدید ہو گیا۔ وہ مسلمان جنہیں آج ہر طرف یہودی اثر و رسوخ اور ان کے فکر و خیال کی برتری نظر آتی ہے، وہ دراصل یا تو یہودیوں کی تاریخ سے مکمل طور پر آگاہ نہیں ہیں یا اسے دانستہ طور پر نظر انداز کرتے ہیں۔

اگر ہم یہودی تاریخ پر معروضی نظر ڈالیں تو پتہ چلے گا کہ یہودی قوم تقریباً چھ سو سال قبلِ مسیح سے اسرائیل کے قیام تک سخت مشکلات کا شکار رہی ہے، اور اسے ارضِ فلسطین سے در بدر پھرنا پڑا ہے۔ یہودیوں پر سخت ترین مشکلات بابلیوں کے دور میں اور بعد میں رومیوں اور نصاریٰ کے دور میں پڑی ہیں۔ اس دوران ان کے معبد بھی تباہ ہوئے اور انہیں کئی بار نسل کشی کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے تباہ شدہ معبودوں میں ہیکلِ سلیمانی بھی شامل جس پر اب بیت المقدس قائم ہے۔ فلسطین سے نکلنے کے بعد یہودی دنیا کے جن خطوں میں در بدر پھرتے رہے ان میں یورپ کا بڑا علاقہ شامل ہے۔ یورپ میں رہائش کے دوران انہیں مسلسل یہود دشمنی کا سامنا کرنا پڑا جسے انگریزی میں Anti Semitism کہتے ہیں۔ اسی یہود دشمنی کے نتیجہ میں وہ جرمنی میں نازی دورِ حکومت میں اس سخت ترین نسل کشی کا شکار ہوئے جسے Holocaust بھی کہا جاتا ہے۔ یہودیوں کے مطابق ہٹلر کے زیرِ اقتدار یہودی نسل کشی میں تقریباً ساٹھ لاکھ یہودی مارے گئے تھے۔ اس نسل کشی کے بارے میں مختلف مباحث ہوتی رہی ہیں۔ عام طور پر اس تلخ حقیقت کو تسلیم کیا جاتا ہے لیکن یورپ کے بعض سخت گیر یہود دشمن اس نسل کشی کی تردید کرتے ہیں یا اس کے اعداد و شمار کو ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ یہودیوں کی مخالفت میں بعض انتہا پسند مسلمان بھی اس نسل کشی کے بارے میں شبہ کا اظہار کرتے ہیں، یا اس کی تردید کرنے والوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یہاں اس حقیقت کا اظہار بھی اہم ہے کہ یورپ میں اب بھی یہود دشمنی Anti Semitism موجود ہے جس کا اظہار مختلف طریقوں سے ہوتا رہتا ہے۔

بار ہا نسل کشی اور یہود دشمنی کے باوجود یہودی قوم اپنی بقا اور اپنی نسلوں کی حفاظت کے کئی طریقہ اختیار کرتی رہے ہے، اس میں علم و دانش میں فضیلت حاصل کرنا، معاشی اور کاروباری ترقی اور خصوصاً مختلف ریاستوں میں مالی معاملات میں ترقی کرنا شامل ہے۔ ان معاملات میں سود پر رقوم ادھار دینا بھی شامل ہے، جو اب ترقی کر کے بنکنگ کا کاروبار بن گیا ہے۔ سودی کاروبار یہودی قوم کی ایک روایتی پہچان بن گیا ہے، جسے اکثر ایک برائی کے طور پر بیان کیا جاتا رہا ہے۔ اس ضمن میں انجیل کی وہ روایات بھی شامل ہیں جن میں، یہودی معبدوں میں مالی کاروبار کرنے والوں اور دیگر کاروباریوں کو حضرت عیسیٰ نے باہر نکال دیا تھا اور ان کی میز کرسیاں توڑ ڈالیں تھیں۔ اسی طرح مختلف کہانیوں میں یہودیوں کو خون آشام سود خواروں کے طور پر پیش کیا جاتا رہا ہے، جن میں شیکسپیئر کا مشہور ڈرامہ Merchant of Venice بھی شامل ہے۔

مسلمانوں کے ساتھ یہودیوں کا معاملہ ملا جلا رہا ہے جس میں کبھی سخت دشمنی اور کبھی مروتوں کے رویے شامل ہیں۔ اسلام کے اوائل ہی میں مسلمانوں کے رسول ﷺ کی مخالفت اور مسلم دشمنوں کا ساتھ دینے کے جرم میں یہودیوں کو مدینہ چھوڑ کر جانا پڑا۔ یہیں سے مسلمانوں میں یہود کی مخالفت شروع ہوتی ہے۔ لیکن بعد کی بڑی مسلمان سلطنتوں میں جن میں بغداد میں بنوعباس اور ہسپانیہ میں اسلامی ریاستیں شامل ہیں، یہودی علم اور دانش کی بنیاد پر مراتب بھی حاصل کرتے رہے اور کبھی کسی خلیفہ کی مذہبی شدت پسندی کا شکار بھی ہوتے رہے۔ عباسیوں کے دورِ حکومت میں علم و دانش کے مرکز، ''بیت الحکمۃ''، میں یہودیوں نے نمایاں علمی عروج حاصل کیا اور مسلمانوں میں علم و حکمت پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اسی طرح اسپین میں مسلمانوں کی حکومتوں میں بھی یہودی عروج و زوال کا سامنا کرتے رہے۔ اندلس کی اسلامی سلطنت کے زوال اور مسیحیوں کی کلیسائی عدالتوں کے احکامات کے نتیجہ میں ظلم کا شکار ہونے کے بعد یہودیوں کی عثمانی سلطنتوں میں پذیرائی بھی ہوئی اور انہیں ان پابندیوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا رہا جو مختلف عثمانی سلطان غیر مسلموں پر عائد کرتے رہے تھے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا تھا، ابتلا کے مختلف ادوار، مسلسل دربدری، اور نسل کشیوں کا مقابلہ کرنے کے لیئے یہودیوں نے مختلف اہم شعبوں میں عروج اور فضیلت حاصل کی اور اس طرح وہ وقتاً فوقتاً دنیا کے مختلف ممالک کے حکمرانوں اور اربابِ سیاست پر اثر انداز بھی ہوتے رہے۔ یورپ میں بڑھتی ہوئی یہود دشمنی کے نتیجہ میں یہودیوں نے امریکہ کی طرف بھی ہجرت شروع کر دی اور یہاں بھی انہیں یورپی نژاد قوموں کے ہاتھوں یہود دشمنی Anti Semitiism کا سامنا رہا جس کا اظہار اب بھی مختلف طرح ہوتا رہتا ہے۔ امریکہ آنے کے بعد یہاں بھی یہودیوں نے علوم، مالی کاروبار، تجارت، قانون، اور ابلاغِ عامہ کے شعبوں میں بڑی ترقی کی اور انہیں رفتہ رفتہ امریکی سیاستدانوں کی حمایت بھی حاصل ہوتی گئی۔ ہٹلر کی یہود دشمنی اور یہودی نسل کشی کے بعد یہودیوں نے اپنی بقا اور اپنے حقوق کی حفاظت کے لیئے انسانی حقوق کے قوانین کے قیام کی کوششیں شروع کیں جن کے نتیجہ میں نہ صرف انہیں بلکہ امریکہ، یورپ، اور دیگر ممالک میں دوسری اقلیتوں کو بھی انسانی حقوق کی ضمانت ملنا شروع ہوگئی۔

اس کے ساتھ ساتھ یہودیوں نے ہر اس ملک میں جہاں انہوں نے رہایش اختیار کی، خیّر ادارے بھی قائم کرنا شروع کر دیئے، جن میں بڑے ہسپتال، جامعات، تعلیمی ادارے، اور انسانی حقوق کے تحفظ کے ادارے شامل ہیں۔ جن سے ہر رنگ، نسل، اور قوم کے لوگ بلا امتیاز فائدے حاصل کرتے ہیں۔ یہودیوں کے قائم کردہ کئی ہسپتالوں اور تعلیمی اداروں سے عام مسلمان شہری بھی فائدہ حاصل کرتے ہیں، اور دولتمند عرب ممالک کے امرا اور رئیس بھی۔ آج تک کبھی یہ خبر نہیں آئی ہے کہ کسی یہودی ہسپتال یا تعلیمی ادارے نے مسلمانوں کے ساتھ کوئی تعصب برتا ہو یا انہیں سہولتیں مہیا کرنے سے انکار کیا ہو۔ کیا آپ نے کبھی سنا ہے کہ کسی یہودی ہسپتال میں مسلمانوں کو مضر دوائیں دی گئی ہوں یا ضرر رساں ٹیکے لگائے گئے ہوں؟

عصرِ حاضر میں مسلمانوں اور یہودیوں کا اصل قضیہ فلسطین کا مسئلہ ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد نوآبادی نظام کے خاتمہ کے وقت صیہونی تحریک کی کوششوں کے نتیجہ میں اسرائیل کا قیام عمل میں آیا۔ اس کا براہِ راست اثر ان فلسطینیوں پر پڑتا ہے جو کم از ایک ہزار سال سے فلسطین پر مسلمانوں کی حکمرانی کے نتیجہ میں وہاں مقیم ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسرائیل کی ریاست قائم کرتے وقت اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے فلسطین میں ایک عرب اور ایک اسرائیلی ریاست قائم کرنے کی قرارداد منظور کی تھی جس کے تحت یروشلم کو الگ خصوصی حیثیت دی گئی تھی۔ اس کے نتیجہ میں یہودی اور فلسطینی شدت پسندوں میں جھڑپیں شروع ہوگئیں اور عرب لیگ کے اس قضیہ میں شامل ہونے کے بعد جنگ کے نتیجہ میں اردن نے دریائے اردن کے مغربی کنارے پر قبضہ کر لیا، مصر نے غازہ کی پٹی پر، اور اسرائیل نے فلسطین کے باقی ماندہ اس تمام علاقہ پر جو اسے اقوامِ متحدہ نے عطا کیا تھا۔ یہی وہ جھگڑا ہے جو آج تک جاری ہے، اور اس علاقہ میں کسی بھی دو قومی ریاستی حل کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اسرائیل اس کا ذمہ دار عربوں کو ٹھیراتا ہے، اور عرب اور مسلم اقوام کسی بھی حل کے تعطل کا ذمہ دار اسرائیل اور اس کے حمایتیوں کو ٹھیراتے ہیں۔ ان میں امریکہ، یورپ، اور دیگر ترقی یافتہ ممالک شامل ہیں۔

یہی وہ صورتِ حال ہے جسے مسلمان یہودی سازش کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح وہ امریکہ اور کینیڈا میں اظہارِ آزادی کے حق پر تنقید کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ ایک طرف تو امریکہ اظہارِ آزادی کے حق کی بات کرتا ہے اور دوسری طرف یہودی نسل کشی کی تردید کو جرم قرار دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکہ اور کینیڈا میں یہودی نسل کشی کی تردید کوئی جرم نہیں ہے۔ جس پر یہودی بھی امریکہ سے نالاں رہتے ہیں۔ یہودی نسل کشی کی تردید دراصل یورپ کے کئی ممالک میں جرم ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ یورپ والوں کو یہ خوف ہے کہ وہاں یہود دشمنی کی باقی ماندہ لہریں پھر کسی نسل کشی میں نہ بدل جائیں۔

دنیا میں قیامِ امن اور مسئلہ فلسطین کے حل کے لیئے مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ یہودی سازشوں کا بے بنیاد خیال ترک کر دیں، اسرائیل کی بقا کے حق کو تسلیم کریں، اور فلسطینی میں دو ریاستی حل کے لیئے اقوامِ عالم کی حمایت حاصل کریں، اور خود ان شعبوں میں امتیاز حاصل کریں جن میں یہودی ممتاز ہیں۔ اسی طرح اسرائیل پر بھی لازم ہے کہ وہ سنجیدگی سے دو قومی حل کی کوشش کرے اور فلسطینی علاقوں میں اپنی بستیاں قائم کرنا ترک کر دے۔ اسی میں امنِ عالم کی ضمانت ہے۔

Published in Urdu Times, USA, Canada, UK, October 04, 2012